

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

گزشتہ ترجمان القرآن میں اس دنیا اور اُس کے مال و متاع کے ساتھ ایک مومن و مسلم کے تعلق کی نوعیت کے سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ ایک مسلمان کے نزدیک حقیقی زندگی تو آخرت کی ہے اور وہی اُس کا اصل ٹھکانہ ہے لیکن چونکہ اُس جیات جاودانی کا راستہ اس عارضی زندگی کی آزمائشوں ہی میں سے گزر کر جاتا ہے اس لیے ایک مسلمان اُسے طے کرنے پر مجبور ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دنیا اور اُس کے سارے اموال و اسباب عارضی اور ناپائیدار ہیں اور اس بنا پر وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اُن پر تکیہ کیا جاسکے تو پھر وہ کونسے ایسے سہارے ہیں جن کے بل پر ایک مسلمان اپنی جیات مستعار کو گزار سکے۔ یہ سوال انسان کی فطرت کا اولین اور بنیادی سوال ہے اس لیے اس کی تاریخ بھی اتنی قدیم اور پرانی ہے جتنی کہ خود انسانیت کی زندگی۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں جس کو اس سوال نے پریشان نہ کیا ہو اور اُس نے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس سوال کا جواب دیئے بغیر ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں اور نہ ہی تمدن و اجتماع کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ اسی کے ذریعے کفر کو اسلام سے، اطاعت کو بغاوت سے، مصیبت کو نیکی اور پرہیزگاری سے مبینہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی سوال کا جواب انسان کا اندازِ فکر اور اسلوبِ جیات متعین کرتا ہے۔ اس کی نوعیت پر ہی سیرت و کردار کے مختلف ڈھانچے تیار ہوتے ہیں اور افکار و تصورات کی صورت گری ہوتی ہے۔ انسان نے آج تک جتنے فلسفے گھڑے ہیں، جس قدر تہذیبوں کو جنم دیا ہے اور جتنے نظامہائے جیات قائم کیے ہیں ان سب میں یہی ایک سوال بنیاد کے طور پر کام دے رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ معاشرت و معاملات

میں، اخلاق و اجتماع میں، سیاست و آئین میں، علم و فلسفہ میں، الغرض حیات انسانی کے سارے مناظر و مظاہر میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی بنیادی سوال کے نرخ زیا کا عکس ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں فرد یا قوم نے اس سوال کے جواب کا فلاں پہلو اختیار کیا ہے تو ہم اُس کی زندگی کے نقشہ کے تمام خانے از خود بھر سکتے ہیں یا اگر ہم کسی قسم کی زندگی یا تمدن کی خصوصیات پر گہری نظر رکھتے ہیں تو ہم اس امر کا باسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس نے اس سوال کے جواب کا کونسا پہلو اختیار کیا ہے۔

ایک غیر مسلم کے نزدیک چونکہ اصل زندگی یہی آب و گل کی زندگی ہے۔ اور آخرت کی زندگی محض اعتباری چیز ہے اس لیے وہ صرف اسی زندگی کے لیے جینا ہے اور اسی کو مادی اعتبار سے بہتر اور پر لطف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرز فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادی زندگی کی دلفریبیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اسی کو معراج انسانیت تصور کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہر وہ چیز بے وقعت ہوتی ہے جو اُس کے تحت میں نہ اُسکے یا جس کی تصدیق مجرد جو اس ظاہری سے نہ ہوتی ہو۔ وہ ہر اسی قوت اور طاقت کا یا تو سرے سے انکار کر دیتا ہے یا اُس کے بارے میں بے یقینی میں مبتلا ہو جاتا ہے جو جو اس سے بالاتر ہو اور اگر وہ کبھی کسی بالاتر ہستی کا اقرار بھی کرتا ہے تو اس کا یہ اقرار صرف زبان کی حد تک محدود ہوتا ہے، اُس کے دل و دماغ اور عملی زندگی پر اس ایمان کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے اور اس طرح اُس کی زندگی کے حسی رجحان، اخلاق و اعمال کی حسی بنیاد میں قطعاً کوئی تزلزل واقع نہیں ہوتا۔ وہ صرف لذت و تمتع کے لیے دنیا میں جینا ہے اور اسی آرزو میں مرتا ہے۔ ایرانی شاعر نے جس مقصد کو بعیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست کہا ہے وہ اس شخص یا قوم کی غایت الغایات ہوتی ہے۔

جو فرد یا گروہ بھی اپنے دل و دماغ میں اس دنیا اور اس کے مال و متاع کے بارے

میں یہ تصورات رکھتا ہے وہ بالکل فطری طور پر ان مادی اسباب کو اس کائنات کی ہر چیز سے نہ صرف عزیز تر سمجھتا ہے بلکہ انہیں بہت بڑی قوت اور طاقت کا حامل بھی خیال کرتا ہے اور انہیں سہارا و پر زندگی بسر کرنے میں وہ اپنی فلاح و کامرانی کا راز دیکھتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے اسے مانے یا نہ مانے مگر دنیا کے یہ مادی اسباب ہی حقیقت میں اُس کے معبود ہوتے ہیں۔ اور انہیں کے بل پر وہ زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے متعلق مختلف مقامات پر بحث کی گئی ہے۔ سورۃ شعراء میں قوم عاد کے اندازِ زیست کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

آتِبْنُونَ بِكُلِّ رِيحٍ آيَةٌ تَعْبَتُونَ
وَتَخِذُونَ مَصَالِحَ نَعْتِكُمْ تَخْلُدُونَ
کیا تم ہر بلند مقام پر بلا ضرورت ایک یادگار عمارت
بناتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو جیسے کہ
تمہیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔
(دکوع - ۷)

اسی طرح رسالت مصلیٰ اللہ علیہ وسلم کو جن لوگوں سے اپنی دعوت کے آغاز میں سابقہ پیش آیا ان میں سے اکثر و بیشتر اسی مادہ پرستانہ تصورِ حیات کے علمبردار تھے، ان کے افکار و اعمال اخلاق و اجتماع میں حبیب پوری طرح نمایاں تھی۔ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے کہ اصل اور حقیقی زندگی یہی مادی زندگی ہے، اس کے اسباب ہی زندگی کے سب سے بڑے اور مضبوط سہارے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی ایسی طاقت اور قوت نہیں جو ان کی زندگی کے اس رشتہ کو کاٹ سکے۔ چنانچہ وہ بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے :-

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا
نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ
انہوں نے کہا کہ دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں
اور زمانہ کے سوا ہم کو کوئی ہلاک کرنے والا نہیں۔

زندگی کے اس طرزِ فکر کے برعکس ایسے اب یہ دیکھیں کہ اسلام ہمیں کس سہارے پر چھینے کی
تعلیم دیتا ہے۔

اسلام جس طرح ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تم اپنا دنیا منے کی بجائے اپنا آخرت بنو، بالکل اسی طرح اس نے ہمارے ذہن میں اس خیال کو بھی راسخ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم اگر اس دنیا میں جہیں تو صرف اُس ذات کے سہارے جئیں جسے کبھی فنا نہیں، جو ہمیشہ کے لیے رہنے والی ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کی تصریحات جا بجا ملتی ہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ - اور تو اس زندہ و جاوید ہستی پر بھروسہ کر جسے

والفرقان - ۵) فنا اور موت نہیں۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَعَلَى اللَّهِ
فَدَيْنَتُوكُلِّ الْمُؤْمِنُونَ - اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (وہی اکیلا ہی مالک و معبود ہے)، اور بس اللہ ہی پر اہل ایمان کو توکل

رقتابن - ۱۴) کرنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا فرماتے تھے

اللهم لك اسلمت وبل امت
وعليك توكلت وايلك انبت وبلك
خاصمت - اللهم اعوذ بعزتك لا اله
الا انت ان تصلي انت الحي الذي
لا يموت والجن والانس يموتون -

اے اللہ! میں تیرے سامنے سر جھکایا اور
تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تجھ پر بھروسہ کیا اور
تیری طرف رجوع ہوا اور میں نے تیرے سہارے
پر جھک لیا۔ اے اللہ! میں تیری عزت کی پناہ
چاہتا ہوں کہ سوائے تیرے کوئی معبود نہیں اس سے
کہ تو مجھے بھٹکنے دے۔ تو زندہ ہے نہ مرے گا۔

جن اور انسان سب فانی ہیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بڑے مہینگانہ انداز میں اس حقیقت کی طرف راہنمائی

کر رہے ہیں کہ ہمیں اُس ذات پاک کے سہارے زندگی بسر کرنی چاہیے جسے موت نہیں چھو سکتی۔ آخر
اس سے زیادہ بیوقوف انسان دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی ہی طرح کی فانی چیزوں پر تکیہ
کر کے زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرے۔

توکل کے معاملے میں دوسری چیز جو ہمیں قرآن پاک کے مطالعہ سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ توکل صرف اسی ذات پر کرنا چاہیے جو سب سے زیادہ قوی، طاقتور اور دنیا کی ہر چیز پر غالب ہے جس کے فیصلے سب فیصلوں پر حاوی ہیں اور جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے :

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ، إِنَّ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يُخْذِلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرْكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ط وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ - (آل عمران)

پھر جب پکارا وہ کہہ لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ سکیگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

پھر اسی مضمون کو سورۃ انفال میں اس طرح بیان کیا ہے :

وَإِنْ جَمَعُوا لَيْسَ لِيُمْفِرُوا فَاجْتَمِعْ لَهُمْ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يَرِيدُ ط إِنَّ يَخْذِعُكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي ابْتَدَأَ بِخَلْقِكُمْ وَمَا يَوْمُ الْمُؤْمِنِينَ (رکوع ۵)

اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھو، بیشک وہ سنتے والا اور جاننے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کا کافی ہے، اسی نے اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔

یہود کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر بڑا فخر اور ناز تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قوت اور طاقت کے ان خزانوں کے مالک ہونے کی وجہ سے کوئی ان کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ اُس کی ذات سے زیادہ علم کس شخص کو حاصل ہے اور اس سے بڑھ کر کون قوت و طاقت کا مالک ہے۔ اس لیے تمہیں ان لوگوں کو پرکھنا کہ برابر بھی اہمیت نہ دینی

چاہیے اور جو بات سچی ہے اُسے بغیر کسی خوف کے صاف صاف بیان کر دینا چاہیے :

اِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَفْقَهُ عَلَىٰ بَنِي
اسْرَائِيْلَ الْكُتٰبَ الَّذِي هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ
وَإِنَّهُ لَهْدَىٰ ذُرِّيَّةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ
اِنَّ رَبَّكَ لَيَفْقَهُ بَيْنَهُمْ جَحْمِيْهِمْ وَهُوَ
الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ فَتَوَكَّلْ عَلٰٓى اللّٰهِ اِنَّكَ
عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ - (رمل - ۶)

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر
کر دیتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں۔ اور بیشک یہ
قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔
بیشک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے
فیصلہ کر دیگا، اور وہی غالب اور جاننے والا ہے
تو خدا پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے

اس کائنات کے خالق اور مالک پر بھروسہ اور اعتماد یوں تو ایمان کی جان ہے اور ایک مسلمان
کو اپنی پوری زندگی صرف اسی ایک سہارے پر بسر کرنی چاہیے، لیکن اس توکل کی حقیقی قدر و قیمت
اور اہمیت انسان کو اُس وقت معلوم ہوتی ہے جب اُس کی زندگی پر اپنے اور مادی اسباب
صرف اُس کا ساتھ چھوڑ دیں بلکہ اُس کے جان لیوا بن جائیں۔ یہی وہ حالات ہوتے ہیں جب ایک
مسلمان کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ جب قدرت نمود دکھتی ہے کہ اُسے اپنے خالق اور مالک پر
کس قدر بھروسہ ہے اور دنیاوی اسباب پر کتنا اعتماد ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ
السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ نِعْمَ الْوَكِيْلُ
ہم کو بس اللہ ہی کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے۔ اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق سے روایت ہے
کہ جب مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ گزیں تھے تو
مشرکین مکہ ہمارے سروں پر آگئے۔ میں نے رسالت اب علی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ
اگر ان میں کا ایک بھی اپنے قدم کے نیچے دیکھے تو ہم کو دیکھ لیگا۔ آپ نے بڑے ہی سکون اور اعتماد
کے ساتھ فرمایا:

مَا ظَنَّاكَ يَا اَبَا بَكْرٍ يَا ثَنِيْنَ اللّٰهُ
اے ابو بکر تم ایسے دو کے متعلق کیا گمان کرتے ہو

تَاٰلِہٖمَا

جن کا تیسرا اللہ ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے توکل کے معنی بے عملی کے لیے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اللہ پر اعتماد اور بھروسے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رگاہ حیات میں کسی قسم کی جدوجہد نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی خلوت کدہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دیگا۔ توکل اور بھروسہ کا یہ تصور سراسر غلط اور باطل ہے۔ اسلام میں اس لفظ کے معنی ہیں کہ کسی کام کو پورے ارادہ و عزم، تدبیر اور کوشش کے ساتھ انجام دیا جائے لیکن اس کام کی تکمیل کے معاملہ میں نگاہ اسباب پر رکھنے کی بجائے سبب الاسباب پر رکھی جائے کیونکہ دنیا کی ہر چیز ماسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

اس حقیقت کو اب ایک مثال سے سمجھیں۔ جب میں کسی کام کے کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں استعمال کرتا ہوں تو لیٹا ہوں ان اعضاء سے کام لیتا ہوں لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اعضاء کی کوئی حقیقت نہیں، ان کو سرگرم عمل کرنے والی چیز وہ قوت اور طاقت ہے جو میرے اندر موجود ہے۔ چنانچہ جب وہ قوت نسلب ہو جاتی ہے تو یہ اعضاء موجود ہونے کے باوجود بالکل عبث اور بیکار ہو جاتے ہیں۔ یہی حال دنیاوی اسباب کا ہے۔ مال و اسباب کی حیثیت اعضاء و جوارح کی ہے۔ جن سے اگر اللہ توفیق دے تو فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن اگر اسے منظور نہ ہو تو یہ سب چیزیں نہ صرف بالکل بے فائدہ بن جاتی ہیں بلکہ بسا اوقات انسان کے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ ان حالات میں اس شخص سے زیادہ بد نصیب اور کون ہو سکتا ہے جو قوت و طاقت کے اصل منبع اور مبداء کو چھوڑ کر محض آلات کو اصل اور حقیقی قوت سمجھنے لگے؟